اسلام اور مغرب: مخاصمت سے مفاہمت تک

شریف شجاع*

ترجمہ: سید راشد بخاری

اسلام کی اشاعت ثقافت کی عالمگیریت (globalization) کے عمل پر کافی حد تک اثر انداز ہوئی ہے۔ اسلام صرف بطور مذہب ہی نہیں پھیلا بلکہ اس نے کئی ایسی زبانوں کو جنم دینے میں بھی مدد دی ہے جو آج مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلموں میں بولی جاتی ہیں۔ افریقہ میں سواحلی (kiswahli) زبان افریقہ کی مقامی زبانوں میں سے اہم ترین زبان ہے لیکن یہ زبان اسلام اور افریقی ثقافت کے باہم ربط و تعمل سے پیدا ہوئی ہے۔ اسی طرح فارسی، اردو، قدیم حوسہ (old housa) اور دیگر زبانوں کے حروفِ تہجی اسلام اور عربی زبان کی دین ہیں۔ عربوں نے دنیا کو عربی ہندسے عطا کیے ہیں جن کے ذریعے بیسویں صدی کا انسانی تجربہ کمپیوٹر کی صورت میں متشکل ہوا ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں آج قرآن اپنی اصل زبان میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ مسلمان ترجمے کے بجائے قرآن کو اس کی اصل عربی زبان میں پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ ترجمے میں قرآنی مفاہیم کے نامکمل ابلاغ یا مطالب میں تبدیلی کا اندیشہ ہوتا ہے۔

اکیسویں صدی کے آغاز پر دنیا کا ہر پانچواں شخص مسلمان ہے۔ اور توقع کی جارہی ہے کہ اس صدی کے دوران نسل انسانی کی ایک چوتھائی تعداد مسلمان ہو جائے گی۔ مغربی دنیا میں اسلام کی قابل لحاظ موجودگی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آج اسلام ایک اہم عالمگیری قوت (globalizing force) ہے۔

---

*Sharif Shuja, "Islam and the West: From Discord to Understanding", *Contemporary Review*, Vol. 278, No. 1629, May 2001, pp. 257-263.

اسلامیت (Islamization) اور مغربیت (Westernization) کا تناظر

بیسویں صدی کے نصف آخر میں مسلمانوں کی مغرب کی طرف ہجرت اور خود مغرب میں قبولیت اسلام کے بڑھتے ہوئے رجحان نے یہاں اسلام کی موجودگی کو بہت نمایاں کر دیا ہے۔ یورپ میں مجموعی طور پر اس وقت بیس ملین مسلمان آباد ہیں جن میں سے آٹھ ملین صرف مغربی یورپ میں ہیں۔ اس تعداد میں ترکی کے مسلمان شامل نہیں ہیں جو پچاس ملین کے قریب ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایک ہزار سے زیادہ مسجدیں اور اسلامی مراکز مغربی دنیا میں آبادیاتی اسلامیت (demographic Islamization) کا مظہر ہیں۔ ملک بھر میں مسلمان انجینئروں، ماہرین سماجیات و تعلیم کی پیشہ ورانہ انجمنیں قائم ہیں۔ اس وقت امریکی مسلمانوں کی تعداد چھ ملین کے قریب ہے جس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ کچھ ماہرین کے مطابق امریکی معاشرے کو اس سبب سے عمومی طور پر اسلام اور مغرب کے درمیان ثقافتی کشاکش کا سامنا ہے۔

اسلام اس وقت وسط ایشیاء میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے۔ سابق سوویت یونین کے خاتمے سے وجود میں آنے والی پانچوں وسط ایشیائی ریاستوں ـــــ قزاقستان، کرغزستان، ترکمانستان، ازبکستان اور تاجکستان ـــــ نے اسلام کو برتر مذہب کے طور پر سرکاری مقام دیا ہے۔ فرانس میں اسلام کیتھولک مذہب کے بعد عددی اعتبار سے دوسرا اہم ترین مذہب ہے۔ برطانیہ میں مسلمان، مسلم سکولوں کے لیے حکومتی رعایات کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ جرمنی میں یہ احساس کافی دیر سے موجود ہے کہ ستر کی دہائی میں ترک کارکنوں کی جرمنی آمد کی حوصلہ افزائی کا مطلب جرمن شہروں میں مسجدیں اور مینار قائم کرنے کی دعوت کے مترادف تھی۔ آسٹریلیا اپنے پڑوس میں سب سے زیادہ آبادی والی مسلمان ریاست انڈونیشیا کا وجود محسوس کرنے لگا ہے۔ برسبین سے پرتھ تک نئی مسجدیں، اسلامی سکول اور قرآنی مراکز قائم ہو رہے ہیں۔

دوسری طرف مغربیت بھی ایک نہایت اہم عالمگیری قوت ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں مغرب نے افریقہ سے ایشیاء تک دو تہائی مسلم دنیا کو اپنی نوآبادیاتی بنایا۔ اسی عرصے میں عثمانی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور یورپی نظام مملکت میں سے اسلامیت کا عنصر مکمل غائب ہو گیا۔ خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ اسلامی

اقتدار کے علامتی مرکز کے خاتمے کے مترادف تھا۔ نتیجتاً امتِ مسلمہ بکھر کر رہ گئی اور مغربی ثقافت کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ قبولیت پیدا ہو گئی۔ دیگر عوامل جو مسلم دنیا کی ثقافتی تغریب (cultural westernization) کا باعث بنے ان میں اسلامی اور قرآنی سکولوں کی جگہ مغربی طرز کے سکولوں کا کھلنا، اہم مسلم ممالک میں یورپی زبانوں کی مقبولیت اور استعمال، اور مغربی میڈیا کے اثرات شامل ہیں۔ بالفاظ دیگر، مغرب نے جواباً اپنی ٹیکنالوجی اور منڈی کے نظریات کو ہی نہیں پھیلایا بلکہ اس کی زبانیں (خصوصاً انگریزی، فرانسیسی اور ہسپانوی) اس کے نظام ہائے تعلیم، صارف ذہنیت (consumer culture)، اس کا عوامی میڈیا، حتیٰ کہ اس کا لباس بھی خصوصاً مردوں کا پہناوا، دنیا بھر میں مقبول ہو گیا۔ اس کا واضح نتیجہ مغربی ثقافت کے (مختلف) پہلوؤں کی عالمگیریت کی شکل میں سامنے آیا۔ لیکن کس قیمت پر؟

مغرب کے قریباً ہر لبرل ملک میں جرائم، تشدد، گلیوں میں دنگا فساد، اپنے عروج پر ہیں۔ محصور شہروں کا کلچر ترقی کر رہا ہے۔ امریکی نوجوانوں میں موت کی دوسری بڑی وجہ خودکشی ہے۔ اس کے اسباب میں خاندان کی اقدار کا زوال اور عمومی قومی بے چینی نمایاں ہیں۔ مقابلتاً مسلم دنیا میں خودکشی کا رجحان نہایت کم ہے۔

کچھ دانشور عالمگیریت کو ایک اور انداز میں بھی دیکھتے ہیں اور اس کے لیے وہ انسانی تاریخ کے تین انقلابات کو مدنظر رکھتے ہیں۔ اسلامی اور مغربی تہذیبوں سے بھی پہلے زرعی انقلاب آیا تھا جس نے انسان اور نباتات کے درمیان تعلقات کو استوار کیا۔ پھر قریباً ہزار سال بعد صنعتی انقلاب آیا جس کے لیے زمین مسلم سائنس دانوں نے تیار کی تھی لیکن بالآخر انقلاب مغرب ہی لایا۔ اس انقلاب نے انسان اور مادی اشیاء اور وسائل کے درمیان رشتہ و تعلق کو مضبوط کیا۔ اور اب اطلاعاتی انقلاب (information revolution) نے مغرب کو بیک وقت ترقی کی معراج پر بھی لا کھڑا کیا ہے اور اسے غیر محفوظ بھی کر دیا ہے۔ بلکہ اسلام بھی اس سے کنارے پر چلا گیا ہے۔ یہ انقلاب انسان اور خود علم کے درمیان تعلقات کو استوار کر رہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مسلم دنیا مغربیت کے منفی پہلوؤں سے دامن بچاتے ہوئے عالمگیریت کے مثبت دائرے میں داخل ہو سکتی ہے؟

بیسویں صدی کی ایک اہم ترین بات یہ ہے کہ اس نے ایک طرف مسلم دنیا میں ثقافتی مغربیت اور دوسری طرف مغربی دنیا میں آبادیاتی اسلامیت کو یکجا کر دیا ہے۔ مسلم دنیا میں ثقافتی مغربیت کی بنیادیں بیسویں صدی کے نصف اول میں پڑی تھیں اور مغربی دنیا کی آبادیاتی اسلامیت بیسویں صدی کے نصف دوم میں پروان چڑھی۔ مسلمانوں کی ثقافتی مغربیت نے مسلمان ممالک سے شمالی امریکہ اور یورپ کی طرف پیشہ ور مسلمان ماہرین اور اذہان کے انخلا کو جنم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں مسلم دنیا کی ثقافتی مغربیت اسی صدی کے نصف دوم میں مغرب کی آبادیاتی اسلامیت کا باعث بنی۔

اسلامی احیاء کا تناظر

مغرب میں بہت سے ایسے دانشور اور پالیسی ساز موجود ہیں جو حالیہ اسلامی احیاء کا بغور مشاہدہ کر رہے ہیں اور اس سوال کا جواب تلاش کر رہے ہیں کہ مغربی درسی کتب اور میڈیا میں اسلام کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ خصوصاً جب اسلام مغربی معاشرے کا لازمی حصہ بن چکا ہے۔ ایک دانشور (علی مزروعی) کے الفاظ میں:

> یہودیت عیسائیت اور اسلام دنیا کی تاریخ میں تین ابراہیمی مذاہب ہیں۔ بیسویں صدی میں مغربی دنیا کو یہودی و مسیحی (Judeo-Christian) تہذیب سے موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اگر امریکہ جیسے ممالک میں جہاں مسلمانوں کی تعداد یہودیوں سے بڑھ جائے گی کیا اسلام عیسائیت کے بعد دوسرا اہم ترین ابراہیمی مذہب بن جائے گا؟ عددی اعتبار سے اسلام مغرب کے بیشتر حصے میں امیگریشن پالیسیاں جو بھی ہوں، یہودیت کو پیچھے چھوڑ جائے گا۔

چنانچہ سوال یہ ابھرتا ہے کہ مغرب کے کمرہ ہائے جماعت میں اسلام کو کیسے برتا جائے؟ مسلم دنیا میں تعلیم بڑی حد تک مغربی ہو چکی ہے۔ تو کیا اب مغرب کی باری ہے کہ وہاں تعلیم جزوی طور پر ہی سہی اسلامی ہو جائے؟ کیا مغربی دنیا عالمگیریت کے مثبت دائرے میں داخل ہو گئی ہے اور ثقافتوں کی روایتی حکمت کو اپنا لے گی جیسا کہ اسلام کی ثقافت ہے جو جرم اور تشدد کے کمتر درجے کے ساتھ زیادہ مربوط معاشرے کی طرف راہنمائی کرتی ہے؟

دنیا کے مختلف حصوں میں بڑھتی ہوئی اسلامی تحریکوں سے جن کا مقصد مسلم خطوں اور وسائل اور مسلم ثقافتوں اور آبادیوں پر مغربی غلبے کی مزاحمت کرنا ہے، مذہب اور اس کے پیروکاروں کے خلاف جارحانہ جذبات کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی ہے۔ یہ حقیقت کہ یہ اسلامی مزاحمتی تحریکیں خود مغرب کے خلاف نہیں بلکہ مسلم دنیا پر مغربی غلبے اور کنٹرول کے خلاف ہیں، عام عوام کی نظروں سے اوجھل ہے۔ اسلامی تحریکیں اپنی زمینوں پر قبضے کے خلاف ہیں جیسا کہ فلسطین اور لبنان کے مسئلے میں، اپنے ہی قدرتی وسائل پر اپنا حق تسلیم نہ کرنے اور ان کے غصب کے خلاف ہیں جیسے خلیج کے شیوخ، اور اپنے مذہب کی بدنامی کے خلاف ہیں جیسا کہ اکثر مغربی میڈیا میں ہوتا ہے۔

سلمان رشدی کی شیطانی آیات (The Satanic Verses) ایک مثال ہے، جس کا نتیجہ خوف ناک نکلا۔ ایک مذہبی راہنما نے مصنف کی موت کا فتویٰ دے دیا۔ ہزاروں افراد ہنگاموں اور فساد میں مبتلا ہو گئے، درجنوں مارے گئے اور آزادی اظہار کے بہادر محافظ اس طوفان میں بہہ گئے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب بہت سے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرتی ہے۔ لیکن سارا سال بہت سے ایسی کتابیں، ڈرامے اور فلمیں تیار ہوتی ہیں جن سے کسی نہ کسی طبقے یا گروہ کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ تہذیب یافتہ قومیں ان پر اپنی ناراضگی یا ناپسندیدگی کا اظہار لائبریرین کو قتل کر کے یا تھیٹر کو بم مار کر نہیں کرتیں۔ مذکورہ مثال میں آیت اللہ کی عدم برداشت کو ہم سب نے محسوس کیا۔ اسلامی گروہوں اور بعض افراد نے رشدی، کتاب کے پبلشر اور مغربی میڈیا کے خلاف سخت جذبات اور غصے کا اظہار کیا، اور کتاب پر فوری پابندی لگانے کا مطالبہ کیا۔ وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ لوگ اپنی جدوجہد کو ابھی تک حاصل نہ ہو سکنے والے حقِ خودارادیت اور حقیقی خودمختاری کی تلاش قرار دیتے ہیں۔ اس طرح کی مسلم مزاحمت کو سیموئل ہنٹنگٹن سمیت بعض مغربی دانشوروں کی طرف سے ''اسلامی خطرہ'' قرار دیا جاتا ہے۔ ہنٹنگٹن نے اپنے مقالے ''تہذیبوں کے تصادم'' میں لکھا ہے کہ ''مغربی اور اسلامی تہذیبوں میں کشمکش تیرہ سو سال سے جاری ہے۔ خلیج کی جنگ اس کی تازہ ترین اہم مثال ہے''۔ اس کے دلائل گزشتہ پورے عشرے سے وجہ نزاع بنے ہوئے ہیں۔

نئے ہزاریے کے آغاز پر ان سوالوں پر غور کرنا نہایت اہم ہے کہ کیا اسلام ایک یک سنگی (اپنے

تمام اظہارات میں یکساں) طاقت ہے؟ کیا اسلام اور مغرب میں تصادم ناگزیر ہے؟ اور کیا جسے اسلامی تہذیب کہا جاتا ہے وہ واقعی مغرب کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے؟

ہنٹنگٹن اسلامی ممالک کو مغرب اور امریکہ کے خلاف دشمنی میں متحد اور وسیع پان-اسلامی تحریک کے حصے کے طور پر دیکھتا ہے۔ ہنٹنگٹن کو اپنے اس نظریے پر اتنا یقین ہے کہ ۱۹۹۰ء کی جنگ خلیج بھی اس کے نزدیک اسلام اور مغرب کے درمیان تصادم کا ایک واضح ثبوت بن جاتی ہے۔

اسلام اور مسلم ممالک کو ایک ہم شکل (monolithic) وجود سمجھنا مستشرقین کے ذہنی مغالطے کی عکاسی کرتا ہے جو سادہ تعریف کی سہولت کے لیے اسلام میں موجود تنوع کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اسلامی تہذیب کو الگ تھلگ اور محدود کر دینے والی یہ شناخت مغربی تخیل کی پیداوار ہے، جس نے ایک بڑی خرابی پیدا کر دی ہے۔ کیونکہ اس ''سادہ تعریف'' نے اسلام کو ''نامعلوم'' اور ''پراسرار'' مذہب بنا دیا ہے۔

یہ نتیجہ فکر مستشرقین کا ہے جنہوں نے اسلام کو داخلی سطح پر مکمل یک رنگ اور خارجی طور پر سیاسی عزائم رکھنے والے مذہب کے طور پر دریافت کیا۔ انہوں نے اسلام کو ایک سیاسی مذہب کے طور پر نئے سرے سے تعمیر کیا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اصل اسلامی مآخذ میں حکومت چلانے اور قائم کرنے کے بارے میں کم ہی کچھ مواد موجود ہے۔ انہوں نے مشرق'' کو بھی ایک خاص مفہوم میں سمجھا ہے جو حقیقت کے قریب نہیں۔

اگر اسلام کے بارے میں سیاسی اور یکساں عزائم کے حامل تصور پر، شک کی گنجائش رکھتے ہوئے، غور کیا جائے تو یہ درست ہے کہ بنیاد پرست تحریک واقعی مسلم معاشروں کی اصلاح کا مخصوص سیاسی مقصد لے کر میدان میں آئی ہے۔ تاہم یہ یقینی طور پر مغربیت کا ردِعمل ہے (جدیدیت کا نہیں) اور اس کی کوشش یہ ہے کہ ممکنہ سماجی بہاؤ اور کمزور ہوتے ہوئے اخلاق کی درستی کی جائے۔ مغرب میں جدیدیت (modernization) کو مغربیت کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مسلم ''بنیاد پرست'' ان دو میں فرق کرتے ہیں۔ جدیدیت کے بارے میں نقطہ نظر کے اس فرق کی بنا پر ہی مغربی تجزیہ نگار سمجھتے ہیں کہ مغربیت کا انکار مغرب کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف ہے۔

یہاں یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ بنیاد پرست تحریک جو ایران، عراق اور لبنان جیسے شیعہ ممالک میں زیادہ متحرک ہے، اس میں خود بہت تنوع موجود ہے اور اکثر اسلامی ممالک میں وہ ایک اقلیتی تحریک ہے۔ بالفرض اگر اسلامی بنیاد پرستی [بہت سے ملکوں میں] تیزی سے پھیل بھی جائے تو ضروری نہیں کہ وہ مغرب کے ساتھ ایک سخت تصادم کی طرف جائے۔ بہرحال مغرب اور خاص طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سعودی عرب کے ساتھ بہت اچھے اور خصوصی تعلقات قائم ہیں جو سب سے زیادہ بنیاد پرست عرب ریاستوں میں سے ایک ہے۔

چنانچہ اگر ہم فرض کرلیں کہ اسلام مغربی ثقافت کے خلاف ایک متحدہ تحریک تیار کرتا ہے تو بھی یہ ضروری نہیں کہ اسلامی تہذیب مغرب کی اصل حریف ہوگی۔ مغربی تجزیہ نگاروں کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جدیدیت کے ساتھ مغربیت کا آنا ضروری نہیں اور مغربیت سے انکار کا مطلب مغرب کے خلاف لازمی اعلانِ جنگ نہیں ہے۔ یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ اسلامی احیاء کئی لحاظ سے ناکام قومی پروگراموں [تحریکوں] کے بعد ایک اسلامی متبادل یا ''حل'' کے طور پر نمایاں ہوا ہے، جو سرمایہ داریت اور کمیونزم دونوں سے مختلف ہے۔

اسلام پسندوں کا دعویٰ ہے کہ اسلام محض چند رسوم و رواج اور عبادات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک جامع نظریہ ہے جو انسان کی ذاتی اور عوامی دونوں زندگیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ سمجھنا نہایت اہم ہے کہ کچھ ممالک میں اسلامی حرکت پذیری فکرمندی کی وجہ تو بن سکتی ہے مگر خطرہ نہیں۔ یہ کسی تہذیب کے لیے چیلنج نہیں ہے۔ تاریخ کی شہادت کے مطابق باقی انتہا پسندوں کی طرح اگر اسلامی بنیاد پرستوں کو بھی سماجی و سیاسی دھارے میں شامل کرلیا جائے تو وہ اعتدال پسندی کی طرف مائل ہوجائیں گے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو پھر یا تو ختم ہوجائیں گے یا غیر متعلق (غیر اہم) گروہ بن کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ مسلسل جمہوری عمل (democratisation) کے ذریعے ہی انتہا پسندی کو بتدریج کم کیا جاسکتا ہے۔ مغرب نے مسلم دنیا اور خاص طور پر مشرقِ وسطیٰ میں جمہوریت کی حوصلہ افزائی کے لیے کم ہی کچھ کیا ہے۔

اب تک کی حقیقت یہ ہے کہ اسلامی احیاء نہ تو ایرانی انقلاب کی پیداوار ہے اور نہ ہی لیبیا کی انتہا پسندانہ پالیسیوں کا نتیجہ۔ ان کی مایوسی اور غصہ یورپی نوآبادیاتی حکمرانی، غیر مقبول حکومتوں کی حمایت اور

مدد اور مسلم حکومتوں کی داخلی کمزوری کا ردِعمل ہے۔ اگرچہ کچھ دانشوروں کے نزدیک مسلم دنیا کی حالیہ بیداری قوت کے زوال اور خدائی حمایت کے نہ ہونے کا ردِعمل ہے۔ درحقیقت یہ بے چینی مسلم ممالک کی کمزور معیشتوں، ناخواندگی اور خاص طور پر نوجوانوں میں بے روزگاری کی بلند شرح کا ردِعمل ہے۔ مسلم دنیا میں سیاسی رواداری، جمہوریتوں اور اچھی حکومتوں کی عدم موجودگی بھی انتہا پسندی کی ایک فوری وجہ ہے۔ اس تناظر میں مسلمانوں کے تبدیلی کے مطالبے مشرقی یورپ کے ایسے ہی مطالبوں سے مختلف نہیں ہیں۔

کئی مسلم ممالک میں لادین (secular)، قوم پرست اور اسلام پسند، مقبول جمہوریت کے مشترکہ مقصد کے تحت متحد ہو چکے ہیں اور ووٹ نہ کہ گولی کے ذریعے جائز طاقت کے حصول کے حق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہی قوتیں اپنے ملکوں میں بادشاہتوں، فوجی آمروں اور مستبد حکومتوں کو ختم کرنے میں بھی باہم تعاون کر رہی ہیں۔ وہ اپنی حکومتوں کو اپنے ممالک کی پسماندگی اور معاشی خود انحصاری حاصل کرنے اور ترقی میں ناکامی کا ذمہ دار ٹھہراتی ہیں۔ ان داخلی وجوہات کے علاوہ کچھ خارجی عوامل بھی ہیں جو اسلام پسندوں کو ان مسلمانوں کے تحفظ کی کوششوں پر اکساتے ہیں جو ظالمانہ حکمرانی کا شکار ہیں۔ مسلمان فلسطین کے عوام کے لیے پریشان ہیں اور وہ بوسنیا، چیچنیا اور کشمیر میں مسلمانوں کے بے رحمانہ قتل عام کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔ یہ تجربات مسلمانوں کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ مغرب ان کے خلاف ہے۔

اس مصنف کے خیال میں بوسنیا، چیچنیا اور کشمیر میں تنازعات کی نوعیت سیاسی ہے۔ دوسروں کے نزدیک یہ جھگڑے براہ راست مذہبی اختلافات کی بنیاد پر بھی ہو سکتے ہیں یا کم از کم ان میں مذہب کا کچھ نہ کچھ عنصر ضرور موجود ہو سکتا ہے۔ فوجی ذرائع بہرحال حل کی طرف نہیں لے جا سکتے۔ ان کے مناسب حل کے لیے سائنسی طریقہ کار، ہوش مندانہ تجزیہ اور معتدل اور متوازن دلائل اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ جنگ کو ناپسند کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کو اس کا مطالعہ یا اسے سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اور سیاست دانوں کے رویوں کو ناپسند کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم انہیں نظرانداز کر سکتے ہیں۔

کرنے کا کام

ہمیں سب سے پہلے اس مقدمے سے شروع کرنا چاہیے کہ ہمارے عالمی قریے (global village) کے تمام ارکان کو آپس میں ہم آہنگی، موافقت اور پرامن دنیا کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس چیز پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ تمام مذاہب کا مقصد دنیا میں امن کا حصول ہے۔ تنازع عموماً اس طریقہ کار اور ذرائع پر ہوتا ہے جو مذاہب کے نمائندے اختیار کرتے ہیں اور جس طرح اپنے اصولوں کا نفاذ چاہتے ہیں۔

اس تناظر میں ہر شخص کو اسلام کی واضح تعلیمات سے آگاہ ہونا چاہیے۔ مغرب میں کچھ تجزیہ نگاروں کا خیال یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی اور اسلامی احیاء دونوں مغربی ثقافت کے لیے خطرہ ہیں۔ مطالعہ اسلام سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کوئی جارحانہ نظریہ نہیں ہے۔ اسلام دیگر عالمی مذاہب کی طرح امن اور سماجی انصاف کا مذہب ہے۔ درحقیقت اسلام اتنا ہی عالمگیر ہے جتنا کہ عیسائیت اور اس پیچیدہ اور نہ سمجھ میں آنے والی دنیا میں انسانوں کو مقصد کی تلاش میں مدد دیتا اور ان کی راہنمائی کرتا ہے۔ یہ بنیاد پرست عسکریت کی طرف مائل نہیں ہوتا کیونکہ یہ ہمیشہ سے تحمل اور برداشت والا مذہب ہے جو انتہا پسندی اور قتل و غارت کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسلام دہشت گردی اور دھمکی آمیز رویے کی قطعاً حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ یہ جارحانہ تصورات اسلام میں بطور عقیدہ شامل نہیں ہیں۔ وہ گروہ جو اسلام کے جھنڈے تلے دہشت گردی کرتے ہیں ایک محدود سی اقلیت ہیں جنہیں مسلمانوں کی اکثریت مسترد کر چکی ہے۔ جارحانہ رویوں کے تعلق سے مغربی دانشوروں کے لیے اہم پیغام یہی ہے کہ وہ انتہا پسند مسلمانوں کی مخالفت کریں لیکن سارے اسلام پر الزام تراشی نہ کریں۔

آج کے تنازعات کل کی توقعات اور تمناؤں میں بدل سکتے ہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ امن کی ثقافت کو عام کیا جائے، جس سے اسلام اور مغرب کے درمیان بین الثقافتی افہام و تفہیم پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔ عرب اور مسلم دنیا کی ثقافتوں کے بہتر علم کے ذریعے یہ تفہیم تحمل اور برداشت کا رویہ پیدا کرے گی اور تنازعات کے حل میں مدد دے گی۔

اب جبکہ مسلم دنیا کے پاس پاکستان کی وساطت سے ایک ''اسلامی نیوکلیر بم'' موجود ہے تو مسلم

قیادت کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔ اس بات کے پورے امکانات موجود ہیں کہ مستقبل قریب میں کوئی اور مسلم قوم اس معاملے میں پاکستان کے ساتھ آ شامل ہو۔ مغرب کو یہ خطرہ نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ دنیا ایک زیادہ خطرناک اور غیر مستحکم مقام پر آ کھڑی ہوئی ہے۔

صدر کلنٹن نے کہا تھا کہ ۱۹۹۸ء کے واقعات (جب پاکستان/ بھارت نے ایٹمی دھماکے کیے تھے) سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ معاملات کس انداز میں چلیں گے۔ یعنی اسی طریقے سے آئندہ جنگیں لڑی جائیں گی۔ ممکن ہے وہ درست ہوں۔ لیکن مسلم دنیا کا ردِعمل اس پر منحصر ہے کہ آیا دنیا میں عسکری ماڈل پروان چڑھتا ہے یا اعتدال پسندی۔ چنانچہ مغرب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلام کو سمجھے اور مسلم دنیا میں اعتدال پسندی اور جمہوریت کی بھرپور حوصلہ افزائی کرے۔

یقیناً انتہا پسندی کو مرحلہ وار جمہویت کے ذریعے ہی کم کیا جا سکتا ہے۔ مسلم دنیا میں جمہوریت کی طرف منتقلی کی کوششیں کی جانی چاہییں۔ انہیں یہ احساس دلانا چاہیے کہ مغرب ان کے ساتھ ہے۔ خاص طور پر وہاں ایسی تحریکیں ابھرنی چاہییں جو جمہوری اقدار پر زور دیتی ہوں۔

نیا ہزارہ یہ اسلام اور مغرب کے درمیان تعلقات میں نئے چیلنج اور نئے مواقع لے کر طلوع ہوا ہے۔ مذہبی راہنماؤں کے لیے ناگزیر ہو چکا ہے کہ وہ اپنے مذہب کے اصل جوہر کے نفاذ کی کوشش کریں اور ان عوامل کی تلاش کریں جو دیگر مذاہب کے ساتھ اشتراکات اور افہام وتفہیم کی فضا پیدا کر سکیں۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ دیگر مذاہب کے راہنماؤں کے ساتھ مکالمے کے ذریعے مشترک عناصر کو تلاش کیا جائے اور ثقافتی تنوع کے وسیع مسائل سے عہدہ برا ہونے کے لیے کچھ معیارات طے کیے جائیں۔ حکومتوں کو بھی اس طرح کی کوششوں کی بھرپور حمایت اور مدد کرنی چاہیے۔ اعتدال پسند مسلمانوں نے اس کی اچھی مثال حال ہی میں پیش کی جب انہوں نے افغانستان کی حکومت کے بدھا کے مجسموں کو گرانے کے فیصلے کے خلاف دنیا بھر میں احتجاجی مظاہروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

یہ عمل جاری رہنا چاہیے کیونکہ بدلتی ہوئی دنیا میں نئے راستے ڈھونڈنا پڑتے ہیں۔ آج ہم ثقافتی تنوع کی اصطلاح میں سوچ رہے ہیں۔ پیغام یہ ہے کہ سب لوگ ایک جیسے نہیں لیکن ان کا مختلف ہونا ایک دوسرے کے مفاد میں ہے۔ ان کے معاشرے اور ثقافتیں تاریخی طور پر اور حیرت انگیز راہوں سے

ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنا بجائے خود ایک روشن کر دینے والا عمل ہے جس کے فوائد مادی بھی ہیں، سیاسی بھی اور ثقافتی بھی۔

[شریف شجاع بونڈ یونیورسٹی آسٹریلیا میں بین الاقوامی تعلقات کے شعبے میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ آپ بین الاقوامی جرائد میں باقاعدگی سے لکھنے کے علاوہ ایک کتاب "اکیسویں صدی میں روس کی مشرقی ایشیاء پالیسی" کے مصنف بھی ہیں۔]